علامہ اقبال: تفہیم و تشریحِ مثنویِ مولانا رومیؒ کا نقطۂ عروج

(Allama Iqbal: The Pinnacle Point of Understanding & Interpretation of Masnavi Maulana Rumi)

DOI: https://doi.org/10.54692/nooretahqeeq.2023.07042093

ڈاکٹر راشد حمید
Dr. Rashid Hameed
Executive Director
National Language Promotion Department, Islamabad

Abstract:

The relationship between Maulana Jalal-ud-Din Rumi and Allama Iqbal is quite unique on the intellectual level. The process of conveying the subjects of Sufism to the common people through the Masnavi began with Hazrat Sultan Abu Saeed Abul Khair, and the ascension was given to it by Maulana Rumi. Ahmad Rumi, influenced by Rumi was the first to interpret this Masnavi in India. Until Allama Iqbal, many commentaries of the Masnavi had come to the fore. Iqbal also wrote a Masnavi on the style of this Masnavi in the form of Asrar-e-Khudi and kept the same 'Bahr' as well. Except for Gulshan-e-Raz-e-Jadid, all Masnavis of Iqbal are in this 'Bahr'. The influence of Masnavi Maulana Rumi on the thought and literature of Muslims has never been seen before in the history of poetry. Iqbal transferred the intellectual revolution found in this Masnavi to his poetry. All of Iqbal's poetry, letters, essays and sermons are interpretations of Rumi's beliefs, ideas and thoughts. Iqbal's concept of self-recognition is the epitome of Rumi's bravery, courage and strength. More or less seven and a half hundred years have passed since Masnavi Maulana Rumi came to the fore; no era has passed without the interpretation and reinterpretation of this creation. Before Iqbal, commentators continued to highlight the moral aspects of this Masnavi, but Iqbal gave it a new interpretation and made it the source and axis of the world revolutions. In this research paper, the relationship between Iqbal and Rumi and the understanding and interpretation of Masnavi Maulana Rumi through Iqbal's poetry have been discussed.

Keywords:

Maulana Rumi, Allama Iqbal, Masnavi Rumi, Masnavi Ma'anvi, Tasawuf, Sufism, Self Recognition

حکیم معنوی اور تشبیہ و تمثیل کے بادشاہ مولانا جلال الدین رومیؒ اور علامہ محمد اقبالؒ کے تعلق و نسبت کا بیان

کہاں سے آغاز کیا جائے اور کیسے کیا جائے؟ یہ مرحلہ جتنا سہل ہو سکتا ہے اس سے زیادہ دشوار بھی ہے۔ دونوں نابغوں اور عبقریوں کے ادوارِ حیات میں سیکڑوں برسوں کا بُعد، باوجود ان کی غیر معمولی فکری ہم آہنگی اور قدرے یکساں وجود اس طرح کے تجزیے کے راستے کا بہت بھاری پتھر ہے۔

مولانا جلال الدین رومیؒ ۳۰ر ستمبر ۱۲۰۷ء کو بلخ میں پیدا ہوئے اور ۱۷ر دسمبر ۱۲۷۳ء کو قونیہ میں وفات پائی۔ وفات کے تین برس بعد ان کا مقلد احمد رومی ہندوستان منتقل ہوا اور پچاس برس اودھ میں مقیم رہ کر راہی ملک عدم ہوا۔ احمد رومی نے مثنوی مولانا رومیؒ کی شرح ''دقائق الحقائق ور قائق الطرائق'' کے نام سے لکھی۔ ہندوستان کو یہ شرف حاصل ہے کہ مولانا جلال الدین رومیؒ کی مثنوی کی شرح یہاں لکھی گئی۔ بعد میں تو مثنوی کی درجنوں نہیں بیسیوں شرحیں اتنی ہی زبانوں میں لکھی جاتی رہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

مولانا جلال الدین رومیؒ سے پہلے شاعری اور تصوف کو رباعی کے رنگ میں برتنے کی ابتدا حضرت سلطان ابو سعید ابو الخیرؒ نے کی۔ ان کے بعد حکیم سنائیؒ نے مثنوی کے قالب میں تصوف کو عوام تک پہنچانے کی سعی کی۔ تیسری بڑی شخصیت جس نے تصوف کی موشگافیوں کو مثنوی کے شعری قالب میں ڈھالا، وہ حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ تھے۔ انھوں نے مثنوی کے علاوہ بعض دوسری اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ ان کے بعد مولانا جلال الدین رومیؒ کی مثنوی تو جیسے عالمی شعری تاریخ میں فکر انگیز ہی نہیں انقلاب خیز اور فکری و تخلیقی دوام حاصل کرنے والا غیر معمولی کارنامہ ہے۔ مولانا نے تصوف اور علم و حکمت کے ایسے ایسے نادر جواہر ریزے تخلیق اور قلم بند کیے کہ آج سات سو برس کے بعد بھی ان کی تابانی میں غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے۔ علامہ محمد اقبالؒ نے انھیں امتیازات کے سبب پیام مشرق میں ''جلال و ہیگل'' کے عنوان سے لکھی نظم میں مولانا کو پیر یزدانی کے نام سے یاد کیا۔[۱] مولانا رومیؒ کے بارے میں میاں بشیر احمد لکھتے ہیں:

> ''غزالی (م۔۱۱۱۱ء) اور ابن العربی (م۔۱۲۴۰ء) اور رومی اسلام کے تین سب سے بڑے صوفی مانے گئے ہیں اور سنائی (م۔۱۱۵۰ء) اور فرید الدین عطار (م۔۱۲۳۰ء) اور رومی (۱۲۰۷ء تا ۱۲۷۳ء) سب سے بڑے تین صوفی شاعر تسلیم کیے گئے ہیں۔ رومی مفکر بھی تھے اور شاعر بھی اور بعض باتوں میں وہ ان تمام نامور بزرگوں سے سبقت لے گئے۔ اُن کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم ہے کہ آج کوئی اسلامی ملک ایسا نہیں جہاں اُن کا نام عزت و محبت سے نہ لیا جاتا ہو۔ وسط ایشیا میں ازبک زبان بولنے والے ترکوں کے ملک میں پیدا ہوئے۔ اُن کا شجرۂ نسب حضرت ابو بکر صدیقؓ سے جاملتا ہے۔ ان کی والدہ خوارزمی ترک تھیں۔ انھوں نے خود ایران کی زبان میں لکھا۔ انھوں نے یونانیوں کی حکمت اور عربوں کی علمیت سے استفادہ کیا، قرآن کو اپنا رہنما بنایا اور بالآخر سلجوقی ترکوں کی مہمان نواز اور قدر شناس قوم کے درمیان اپنی

زندگی کے دن گزارے اور دنیا کو اپنا روحانی پیغام دیا۔"(۲)

مولانا رومیؒ کی زیر بحث مثنوی چھے دفتروں اور چھبیس ہزار شعروں پر مشتمل ہے۔ بحر رمل مسدس مخذوف میں تخلیق ہونے والی اس مثنوی کی نسبت سے کہا گیا کہ ایران میں چار کتابیں بے پناہ مقبول ہوئیں جن میں شاہ نامہ فردوسی، گلستان سعدیؒ، دیوان حافظؒ اور مثنوی رومیؒ شامل ہیں مگر یہ بات برملا اور بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ جو شہرت اور مقام و مرتبہ مثنوی رومیؒ کو حاصل ہے، وہ باقی تین کو نہیں۔ علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

"مثنوی کو جس قدر مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی، فارسی کی کسی کتاب کو آج تک نہیں ہوئی۔ صاحبِ مجمع الفصحا نے لکھا ہے کہ ایران میں چار کتابیں جس قدر مقبول ہوئیں، کوئی اور کتاب نہیں ہوئی۔ شاہنامہ، گلستانِ، مثنوی مولانا رومی ، دیوان حافظ۔ ان چاروں کتابوں کا موازنہ کیا جائے تو مقبولیت کے لحاظ سے مثنوی کو ترجیح ہو گی۔"(۳)

ضمناً بتانا ضروری ہے کہ علامہ صاحب کے والد گرامی نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ بو علی قلندرؒ کی طرز پر مثنوی لکھو۔ علامہ صاحب نے حکم کی نہ صرف یہ کہ تعمیل کی اور اسرارِ خودی کی شکل میں مثنوی مولانا رومیؒ کی طرز پر مثنوی لکھی اور بحر بھی وہی رکھی۔ مستزاد یہ کہ علامہ محمد اقبالؒ کی تمام مثنویاں اسی بحر میں ہیں، ماسوائے گلشن راز جدید کے۔ بحر کی یہ پابندی اس لیے ضروری تھی کہ گلشنِ راز کا جواب اسی کی بحر میں دینا انھوں نے ضروری خیال کیا۔

مولانا جلال الدین رومیؒ نے اپنے زمانے میں چنگیز اور ہلاکو کی انسانیت سوز تباہ کاریوں جیسے فتنے دیکھے۔ تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمانوں کو کسی غیر مسلم قوم نے ایسی عبرتناک اجتماعی شکست دی تھی۔ صدیوں میں تعمیر ہونے والی اسلامی تہذیب صرف چالیس دن میں گرد و غبار کی طرح اُڑ گئی۔ دوسری جانب صلیبی جنگوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ فلسطین اور اس کے گرد و نواح میں غیر مسلموں نے وحشت و بربریت کا وہ بازار گرم کیا کہ الاماں۔ ادھر ہسپانیہ میں مسلمانوں کی سلطنت ختم ہو گئی۔ گویا پوری دنیا میں مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا، علما تہ تیغ ہوئے اور علم و حکمت کے خزانے بری طرح پامال کیے گئے۔ نوے لاکھ نفوس فتنے کی نذر ہوئے۔ اس ماحول میں مسلمانوں کے عام طبقے میں ہر طرح کی برائی نے جنم لیا۔ گویا معاشی اور سیاسی زوال تو آنا ہی تھا، تہذیبی اور اخلاقی زبوں حالی ناقابلِ بیان حد تک اسلامی جسدِ اجتماعی میں سرایت کر گئی۔ مولانا محمد عبد السلام خاں لکھتے ہیں:

"ساتویں صدی کا بڑا حصہ مولانا کا عہد ہے اور ساتویں صدی ہجری خاص طور سے مسلم تاریخ کا تاریک، پُر آشوب اور ہولناک دور ہے۔ مسلم دنیا کے لیے یہ سخت ابتلا اور بے چینی کا زمانہ تھا، جان، مال اور عزت کوئی چیز محفوظ نہ تھی۔ عام اور خاص کی تفریق کے بغیر پورا مسلم معاشرہ بے چارگی، مایوسی، بے یقینی اور خوف و ہراس کا شکار تھا۔ طوائف الملوکی، جنگ و جدل تو تھے

ہی کہ ایک عام سیلاب بلا پوری اسلامی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لینے کو بڑھا چلا آ رہا تھا۔۔۔۔ ارضی اور سماوی آفات بھی مسلمانوں پر رحم نہیں کھا رہی تھیں، بلا پر بلا غالب تھی، قحط نے علاقے کے علاقے تباہ کر دیے تھے، لوگ کُتوں بلیوں کو ہی نہیں بچوں تک کو بھون کر کھا گئے۔ وباؤں نے آبادیاں کی آبادیاں صاف کر دیں۔ بھرے گھر خالی ہو گئے زلزلوں نے شہر کے شہر تہ و بالا کر ڈالے، جہاں بڑے بڑے محل اور حویلیاں تھیں وہاں اونچے نیچے تودوں اور غاروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ہر طرف سراسیمگی اور ہراس کا دور دورہ تھا۔

مسلم دُنیا کی خود غرضیوں، جاہ طلبیوں اور خوں ریزیوں پر قدرت کی طرف سے یہ تنبی ہیں تھیں لیکن ان سخت تنبیہوں نے بھی کوئی اثر نہیں کیا تھا۔۔۔۔ تاتاریاں یورش نے لگ بھگ سارے اہم مسلم مقبوضات کو پامال کر دیا، ہزاروں شہر اُجاڑ دیے، علوم و فنون کے بڑے بڑے مرکز ویران ہو گئے، جن بستیوں میں علما و فضلا کا مجمع تھا اور تشنگانِ علوم کارواں در کارواں دن رات اُترتے تھی وہ سب بے چراغ ہو گئیں، بخارا خاک کا ڈھیر ہو گیا، ساری آبادی تہ تیغ کر دی گئی۔ سمرقند جل کر راکھ ہو گیا، باشندے قتل ہو گئے۔ بلخ، رے، ہمدان، زنجان، قزوین، مرو، نیشاپور اور خوارزم جیسے عالم اسلام کی پیشانی کے چمکتے ستارے ٹوٹ کر مٹی میں مل گئے۔ عروس البلاد بغداد، دُنیائے اسلام کا جگمگاتا تاج، ہلاکو کی وحشی اور خونخوار فوج کے ہاتھوں تاخت و تاراج ہو گیا۔"(۴)

دور از کار تاویلوں میں کلام الٰہی حادث ہے یا قدیم، ذاتِ مطلق صفات سے الگ ہے یا نہیں، تعددِ صفات کا عقیدہ توحید سے ٹکراتا ہے یا نہیں، علم حجابِ اکبر ہے یا نہیں اور خدا کا وجود حقیقی ہے یا نہیں وغیرہ شامل تھیں۔ ان موضوعات پر اسلامی معاشرہ آپس میں متحارب تھا اور ظاہر پرستی غالب آ چکی تھی۔ ایک طرف مسلمانوں کے دل و دماغ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے دین کے بارے میں شکوک و شبہات نے کثرت سے جنم لینا شروع کیا تو دوسری طرف کلامی علما و فقہا کی دور از کار تاویلوں نے اسلامیانِ عالم کو اس حد تک متشکک اور مایوس کرنا شروع کر دیا کہ وہ مفلوج ہو کر رہ گئے۔

ایسی فضا میں مولانا جلال الدین رومیؒ کی شخصیت روشن مینار کی صورت میں نمودار ہوئی۔ مولانا دینی علوم کے ساتھ ساتھ جدید عقلی علوم سے بھی بہرہ ور تھے۔ خاص بات یہ کہ وہ فرقہ باطنیہ کی دو سو سال سے بھی زیادہ مدت کی مسلسل محنت کے بعد پیدا کیے گئے اتحاد، حلول، تجسم، غیبت اور بروز وغیرہ جیسے تباہ کن داخلی فتنوں سے کماحقہٗ آگاہ تھے۔

مولانا جلال الدین رومیؒ نے مسلمانوں کی عمومی مایوسی، بے عملی اور تیزی سے رہبانیت میں تبدیل ہوتی ہوئی دینی کج فکری یک سر مسترد کر دی۔ مولانا نے اسلام کی نئی تعبیر پیش کر کے تجدید کا لازوال فریضہ انجام دیا۔ انھوں نے

اپنی تمام غیر معمولی علمی فتوحات اور بصیرت کو کام میں لا کر متشکک ذہنوں کو مطمئن کیا۔ بے عملی اور رہبانیت کی طرف لے کر جانے والے وحدت الوجودی تصور کے آگے بند باندھا۔ ترکِ دنیا اور فنا پر زور دینے والے طاقتور مروج نظامِ تصوف کے خلاف بقا اور جہدِ مسلسل کے نظریے کو فروغ دیا۔ مولانا جلال الدین رومیؒ نے غیر معمولی جرأت کے ساتھ رائج تصوراتِ روایتی دین و مذہب کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا۔

مولانا رومؒ کے احوال، مقام و مرتبے اور افکار و نظریات کے حوالے سے ایک وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ متعدد علما کی جانب سے مولانا رومیؒ کے افکار کے ڈانڈے حضرت شیخ اکبر ابن عربیؒ سے بھی ملانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کہا گیا کہ جہاں کہیں بھی توحید اور وحدانیت کا حوالہ مولانا کے ہاں نظر آتا ہے وہ شیخِ اکبر کے فکر کی دین ہے، یعنی سادہ لفظوں میں مولانا رومیؒ، شیخ اکبرؒ سے بے حد متاثر تھے۔ مولانا رومیؒ جن حضرات سے متاثر تھے، ان کا ذکر انھوں نے کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی انداز میں ضرور کیا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ شیخِ اکبر سے متاثر تھے اور ان کا ذکر نہیں کیا۔ دوسری اہم بات یہ کہ تصوف سے علاقہ رکھنے والے تمام صوفیا کے ہاں توحید باری کا ذکر کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو، ایک سطح پر یکساں بھی اسی شدت کے ساتھ ہو گا۔

مولانا نے محدود اور ظنی عقلیت پسندی کے بڑھتے رجحان کو بھانپتے ہوئے عشق و عقل کے درست حدود و قیود بیان کیے۔ زندگی اور موت کے بارے میں رائج تصورات کی درست تفہیم کے لیے روایت سے ضروری تعلق استوار رکھتے ہوئے جدید علوم سے بے پناہ استفادہ کیا۔ بے عملی کو فروغ دینے والے گمراہ کن تصور جبر و قدر کو اس انداز سے شفاف تفہیم عطا کی کہ علمِ کلام کے اس بارے میں رائج تصورات دور از کار مباحث بن کر رہ گئے۔ مولانا نے فکری سطح پر ایسا پائیدار اور متوازن تصور عشق عطا کیا کہ جس کی تازگی نے بے لگام عقل کی یبوست زدہ رائج تاویلیں چاروں شانے چت ہو گئیں۔ بے بدل رومی شناس خلیفہ عبدالحکیم کہتے ہیں:

> ''عشق مثنوی کا اہم ترین موضوع ہے جو اس کے ہر دیگر مضمون پر چھایا ہوا ہے۔ مولانا ہزار طرح اس کی تفسیر کرتے ہیں اور وجد و مستی میں نغمہ ریز ہوتے ہیں لیکن ان کو تسلی نہیں ہوتی، نہ وہ خود عشق کی گوں ناگوں کیفیتوں سے سیر ہوتے ہیں اور نہ اس کے بیان سے ان کو تشفی ہوتی ہے۔''(۵)

مسلمانوں کے اس عہدِ زوال میں جن متعدد صوفیائے کرام نے بے لگام عقل کی غیر معمولی پذیرائی کے خلاف بند باندھے ان میں حضرت بایزید بسطامیؒ، حضرت معروف کرخیؒ، حضرت سری سقطیؒ، حضرت ذوالنون مصریؒ، شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ اور حضرت امام غزالیؒ پیش پیش تھے مگر ایسے صوفیائے کرام جنھوں نے شاعری کے میدان میں یہ کارنامہ انجام دیا ان میں سلطان ابو سعید ابو الخیرؒ، شیخ فرید الدین عطارؒ، حضرت عبداللہ انصاریؒ، حکیم سنائیؒ اور مولانا جلال الدین

رومیؒ شامل ہیں۔

مذکورہ بالا نابغوں کے تصورات عشق و عقل پر یہاں گفتگو نہ بھی کی جائے تو یہ بتانا ضروری ہے کہ حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کی مثنوی کو اس سلسلے میں کیا اعلیٰ مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ اختصار کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مثنوی مولانا رومیؒ نے مسلمانوں کے فکر اور ادب پر بالخصوص اور عالمی ادب پر بالعموم جو اثر ڈالا، وہ اس سے پہلے تاریخِ عالم میں شاعری کے حصے میں کبھی نہیں آیا۔ علاوہ ازیں مثنوی میں قوم و ملت کی اساس سمیت کچھ اور موضوعات بھی ہیں جن کے ذکر سے گریز اس لیے کرنا پڑ رہا ہے کہ بات طویل ہو جائے گی مگر واضح رہے کہ ایسے موضوعات مثنوی مولانا رومیؒ کا بے حد اہم حصہ ہیں۔

حضرت علامہ محمد اقبالؒ ۹/ نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے اور ۲۱/ اپریل ۱۹۳۸ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مغرب کی سائنسی ترقیوں اور حقائق و معارف کی عقلی تعبیروں نے مسلمانوں کے ذہن منتشر، آلودہ اور مضمحل ہو گئے۔ فلسفے نے تشکیک کا وہ بیج بویا کہ دینیات کی بنیادیں ہل کر رہ گئیں۔ مغرب نے سائنسی، سیاسی اور فوجی برتری کے سبب مسلمانانِ عالم کو اس انداز سے نشانے پر لیا کہ وسیع تر فکری کجی کے بعد جو کچھ بچا تھا وہ اس سیلابِ بلاخیز میں بہ گیا۔

عظیم جنگوں میں عباسی خلافت کی طرح عثمانی خلافت ہدف بن کر ختم ہوئی۔ ترکی خاک و خوں میں لت پت ہوئے۔ عرب ممالک مغرب کی ہوس ناکی کا نشانہ بنے۔ ایران مغربی سازش کا شکار ہوا۔ رہ گیا برصغیر تو وہ خیر سے پہلے ہی صدیوں سے غلام ہی نہیں تھا بلکہ خوئے غلامی میں بے حساب راسخ ہو چکا تھا۔ مسلمان عالمی سطح پر ساکن اور جامد روایت اور خرافات کے غلام بن کر رہ گئے۔ پے در پے شکستوں نے انھیں مایوسیوں کے اندھیرے غار میں دھکیل دیا۔ فرقہ ورانہ اور فروعی جھگڑوں نے رہی سہی کسر بھی نکال دی۔

مسلمانانِ عالم کے زوال کا کم و بیش یہی نقشہ مولانا جلال الدین رومیؒ کے عہد میں بھی چشمِ فلک نے دیکھ رکھا تھا۔ تاریخِ عالم یا کم از کم تاریخِ اسلام سے واقفیت رکھنے والے ساتویں صدی ہجری یا تیرہویں صدی عیسوی کیسے بھول سکتے ہیں جب فتنہ تاتار نے فکری طور پر کیسی کیسی فکری جہتوں سے مسلمانوں کو گمراہ اور مفلوج کیا۔ فرقہ باطنیہ جو اس سے بھی دو سو سال پہلے سے مسلمانوں میں گمراہ کن تصوف کو کامیابی سے پھیلاتا چلا آرہا تھا، اب کھل کر مسلمانوں کو عہدِ انتشار کے زرخیز زمانے میں بری طرح نشانہ بنا رہا تھا۔ خدا اور انسان کو ایک سطح پر لایا جانے لگا۔ وحدت الوجود کے ذریعے کج فکری نے مسلمانانِ عالم کو گمراہی کی دلدل میں دھکیل دیا۔ گویا انسان ہی خدا ہے اور خدا ہی انسان ہے۔ کائنات ہی خدا ہے اور خدا ہی کائنات ہے، گویا کائنات کا ہر ذرہ خدا ہے۔ تصوف کی اصطلاحوں میں بروز، اتحاد، حلول، غیبت اور تجسم جیسے قرآن سے متصادم نظریات نے مسلمانوں کو عمل سے دور کر دیا۔ جہاد کا جذبہ تو جیسے بے کار ہو کر رہ گیا۔ ترکِ عمل اور خودی کی

نفی نے ایسا غضب ڈھایا کہ رہے نام اللہ کا۔ یہ صورتِ حال مولانا رومیؒ کو در پیش تھی اور اب اقبالؒ تک آتے آتے حالات نے کم و بیش ویسی ہی شکل اختیار کر لی۔ ذرا اقبال سے سنیے:

چو رومی در حرم دادم اذاں من — ازو آموختم اسرارِ جاں من
بدورِ فتنہ ءعصرِ کہن، او — بدورِ فتنہ ءعصرِ رواں، من (۶)

سو ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے ویسی ہی باکمال شخصیت کا برصغیر میں ظہور ہوا۔ علامہ محمد اقبالؒ اسلامیانِ عالم کے دگرگوں حالات دیکھ دیکھ کر بہت آزردہ رہنے لگے۔ اپنے تئیں شاعری کے ذریعے مسلمانانِ ہند کی ہمت افزائی اور جرأت عمل کو فروغ دینے کی کوشش بھی کی مگر ان کے اندر اصل فکری انقلاب نے اس وقت جنم لیا جب اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے مغرب گئے اور اسے اپنی نظروں سے بہ غور دیکھا، پرکھا اور تجزیہ کیا۔ اس تعلیمی سفر اور قیام کے دوران میں علامہ محمد اقبالؒ نے مغرب کے فکری نظام کا بہت محنت اور توجہ سے مشاہدہ کیا اور اسے سمجھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تفہیم نے علامہ محمد اقبالؒ کو دراصل اقبال بنایا۔

علامہ محمد اقبال کی ۱۹۰۸ء کی نظموں اور غزلوں میں پہلی بار اس فکری انقلاب کے واضح نقوش ملتے ہیں۔ کسی ایک نفس ناطقہ میں اس طرح کے غیر معمولی اور مکمل فکری انقلاب کی مثال ہمیں تاریخ میں کہیں اور نہیں ملتی۔ انھوں نے مغرب کے فکری اور سیاسی نظام کے کھوکھلے پن کو سمجھا اور اسلام کے فکری عروج کا خواب دیکھا۔ اس فکری انقلاب کے ماخذ تلاش کریں تو واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ وہ مولانا جلال الدین رومیؒ جن کی مثنوی کے شعر بچپن سے علامہ محمد اقبال کی سماعتوں سے ٹکراتے چلے آرہے تھے، اب وہ واقعی ان کے مرشدِ معنوی بن چکے تھے۔ علامہ صاحب کے دو شعر ملاحظہ فرمائیے:

پیر رومی خاک را اکسیر کرد — از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد (۷)

حضرت علامہ محمد اقبال نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے "ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقا" میں مولانا جلال الدین رومیؒ کا دوبارہ ذکر کیا۔ (۸) علامہ صاحب کے ہاں اپنے مرشد کے سلسلے کا کم و بیش یہ پہلا علمی حوالہ ہے۔ اس کے بعد بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم، ارمغانِ حجاز (اردو کلام)، اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، پیامِ مشرق، جاوید نامہ، پس چہ باید کرد، اے اقوام شرق، مثنوی مسافر اور ارمغانِ حجاز (فارسی کلام) میں مولانا جلال الدین رومیؒ کے افکار کی واضح پرچھائیاں نظر آتی ہیں تاہم صرف زبورِ عجم میں کہیں مولانا کا ذکر نہیں ملتا۔ یہ الگ بات ہے کہ افکار کی روشنی اس مجموعۂ کلام میں بھی لو دے رہی ہے۔ علامہ صاحب کے خطوط، مضامین، شذراتِ فکرِ اقبال اور تشکیلِ جدید الہیاتِ اسلامیہ کے خطبات، رومیؒ کی خوشبو سے مہک رہے ہیں اور تو اور علامہ محمد اقبالؒ کی نجی گفتگوؤں میں مولانا رومیؒ کے حوالے پلٹ پلٹ کر آتے دکھائی دیتے ہیں۔ علامہ صاحب نے مولانا رومیؒ کو عقائد، خیالات اور افکار میں مماثلت کے سبب مرشد کہا تو واقعی

مرشدِ معنوی بنایا۔ دراصل انھیں اپنے زمانے کے حالات اور مولانا کے زمانے کے حالات میں مماثلت نظر آئی اور انھوں نے دیکھا کہ مولانا رومیؒ نہ صرف یہ کہ فکری طور پر ان کے قریب ترین ہیں بلکہ ان کا فکر اتنا توانا ہے کہ عہدِ انتشار میں ان کی بھرپور راہ نمائی بھی کر سکتے ہیں۔

تاریکی اور شر کی قوتوں کے خلاف مولانا رومیؒ مسلسل نبرد آزما رہے۔ انھوں نے حیات و موت، عشق و عقل، فقر، خودی، تقدیر، حرکت، قومیت، ارتقا اور انسانِ کامل جیسے طاقت ور تصورات کے ذریعے اسلامی نظام کی تشکیلِ جدید کا فریضہ انجام دیا۔ علامہ محمد اقبال کے پاس اپنے زمانے میں مسلمانوں کی عقاداتی، فکری، تہذیبی اور سیاسی زبوں حالی کا علاج اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ مولانا جلال الدین رومیؒ کے بیان کردہ طاقتور نظامِ حیات کو آگے بڑھانے کے لیے انھیں اپنا راہ نما اور پیر و مرشد بنائیں۔ علامہ صاحب نے قطعی فطری فیصلہ کیا اور اپنے نظامِ فکر کو مولانا کے فکر کی روشنی سے منور کر کے ایک بار پھر اسلامی نظام کی بے حد ضروری تشکیلِ جدید کا ڈول ڈالا۔

مغرب کے تصورِ قومیت نے دنیا کو کس طرح اپنی لپیٹ میں لیا، کوئی ڈھکی چھپی حقیقت نہیں۔ علامہ محمد اقبال کے دور میں پوری دنیا میں اس کا رائج ہونا طشت از بام ہے۔ کون واقف نہیں کہ علامہ محمد اقبالؒ نے فتنہ قومیت سے اپنی عمر کے آخری حصے میں فیصلہ کن جنگ لڑی اور جیتی۔ اس تصورِ قومیت کے حوالے سے علامہ محمد اقبال کے اتنے طاقت ور نظریاتی مؤقف کی پشت پر بھی مولانا جلال الدین رومیؒ کا تصورِ قوم و ملت ایستادہ ہے۔

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ علامہ محمد اقبالؒ کی روحانی، فکری اور تہذیبی تربیت مولانا رومیؒ نے کی مگر اقبال کیسے خوش نصیب شاگرد اور مرید ہیں کہ جدید مغربی فکر و فلسفے اور سائنس کے عروج کے زمانے میں مثنوی مولانا جلال الدین رومیؒ سے دنیا کو نئے علوم کی روشنی میں ازسرِ نو روشناس کرایا۔ ان کا اصل کارنامہ تو یہ ہے کہ مولانا رومیؒ کو حلقۂ تصوف سے نکال کر ایک عظیم فلسفی کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ علامہ صاحب نے ڈارون، کانٹ، نٹشے، شوپن ہاور اور برگساں کے افکار میں مثنوی رومی کی جھلکیاں جدا جدا نشان زد کر کے منکشف کیں۔ انھوں نے غیر معمولی کامیابی کے ساتھ باور کرایا کہ جن تصورات کی بنیاد مغرب نے جدید علوم و افکار کی عمارت کھڑی کرنے کی کوشش کی ہے اس میں خرابی یہی ہے کہ استفادے کا اعتراف کیا نہ ہی ان تصورات کو درست طور پر سمجھا لہٰذا تاثریا می رود دیوار کج۔

علامہ محمد اقبالؒ نے مولانا جلال الدین رومیؒ سے تصورِ خودی مستعار لیا اور فرد کی انفرادی اور اجتماعی تربیت کے لیے اس کے مراحل بتا کر پرتیں کھولیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بعض ناقدین نے کہا کہ مولانا رومیؒ کا تصورِ خودی، تصوف سے زیادہ علاقہ رکھتا ہے لہٰذا جذباتی اور جمالیاتی پہلو نمایاں ہوتے نظر آتے ہیں جب کہ علامہ محمد اقبالؒ کا تصورِ خودی انفرادی اور اجتماعی حوالوں سے تربیت کا مکمل اور مفصل نظام فراہم کرتا ہے لہٰذا جذباتی کے ساتھ ساتھ فکری حوالے سے بھی طاقت ور ہیں۔

مولانا اور علامہ صاحب دونوں کو اسلامی دنیا کا ذہنی جمود اور انحطاط بہت کھلتا ہے۔ دونوں حرکت و عمل، حریت فکر، جرأت و قوت، جہدِ مسلسل اور سعی پیہم کے داعی ہیں۔ مبارزہ طلبی، سخت کوشی اور ہنگامہ پیکار کے سلسلے میں دونوں کے موضوعات مشترک ہیں۔ اضطراب اور کشمکش پیر و مرشد کے تخلیقی کرشموں، کارناموں اور فکر و فلسفے کی کلید ہے۔

مولانا رومیؒ کی مثنوی کو منظر عام پر آئے کم و بیش ساڑھے سات سو سال گزرے۔ کوئی زمانہ بھی اس تخلیق کی تشریح و تعبیر نو کے بغیر نہیں گزرا۔ یہ تسلسل اور دوام بے حد غیر معمولی ہے۔ یہ تخلیق نہ صرف یہ کہ فارسی کی مقبول ترین شعری کتاب ہے بلکہ عالمی شعری ادب میں بھی اس کی مقبولیت کا گراف کبھی نیچے نہیں آیا۔ اس کی مقبولیت کا عالم یہ رہا کہ بعد از مثنوی مولانا رومیؒ تصوف کے مضامین کے لیے صرف مثنوی ہی کی صنف میں شعر لکھنا ضروری قرار پایا۔ دسویں اور گیارہویں صدی ہجری میں مثنوی ہندوستان میں نصاب کے طور پر درس و تدریس کا لازمی حصّہ بنتی چلی گئی۔ مثنوی کے فرہنگ نویس کثرت سے سامنے آتے گئے۔ اورنگ زیب عالم گیر کے دور تک آتے آتے مثنوی اپنی ہمہ گیر مقبولیت کے سبب محبوب ترین کتاب بن گئی۔

یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ مولانا رومیؒ کی یہ مثنوی ہر اس زمانے میں غیر معمولی اہمیت اختیار کر جاتی تھی جس میں مسلمانوں کو اجتماعی طور پر انتشار اور اضطراب گھیر لیتا تھا۔ ایسے ادوار میں مثنوی درد مند مسلمانوں کو اپنی جانب راغب کرتی رہی ہے لہٰذا ایسے زمانوں میں اس کی تعبیر و تشریحِ نو کی ضرورت بھی پیش آتی رہی۔ آشوب کی ان زمانوں میں خدا، کائنات اور انسان کی عظمت و رفعت کے نظریات ڈگمگانے لگتے تھے اور خاص طور پر مذاہب کی کشتی ہچکولے کھا رہی ہوتی تھی۔ مولانا رومیؒ کی مثنوی تو تخلیق ہی ایسے زمانے میں ہوئی تھی جب پہلی بار مسلمانوں سے پوری دنیا میں اقتدار چھین لیا گیا تھا۔ اس حوالے سے تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے لیکن اگر سرسری سی فہرست بنائیں تو اس طرح کے پہلے دور میں خوارزمی کی جواہر الاسرار، دوسرے دور میں عبد اللطیف عباسی کی مولانا رومیؒ اور اُن کی مثنوی کے بارے میں تصنیفات، تیسرے دور میں مُلّا بحر العلوم کی ''شرح مثنوی''، چوتھے دور میں مولانا شبلی نعمانی کی ''سوانح مولانا رومیؒ'' اور پھر پانچواں دور قرار دیں یا زمانہ حال تک بعد از شبلی مثنوی مولانا رومیؒ کی اہمیت کا عنوان دیں، ہمیں علامہ محمد اقبال نمایاں تر نظر آتے ہیں۔

ان تمام ادوار میں مثنوی مولانا رومیؒ کے شارحین نے زبان کی مشکلات حل کیں، صوفیانہ معانی و مطالب کی روشنی میں شرحیں لکھیں، فلسفہ و حکمت کے اسرار و معارف کھوج کر سمجھانے کی کوشش کی مگر اقبال نے اچھوتا اور کمال کام یہ کیا کہ مثنوی مولانا رومیؒ کو حظ اندوزی کی غرض سے پڑھے جانے کی سطح سے اوپر اُٹھایا اور عمل کا دستورِ حیات بنا کر پیش کیا۔ بہت احتیاط کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال نے مثنوی مولانا رومیؒ کی تفہیم و تعبیر کے تمام زاویے بدل کر رکھ دیے۔ ملاحظہ کیجیے نژادِ نو سے خطاب کرتے ہوئے اقبال کیا کہتے ہیں:

پیرِ رومی را رفیقِ راہ ساز — تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
زانکہ رومی مغز را داند ز پوست — پائے او محکم فتد در کوئے دوست!
شرح او کردند و اورا کس ندید — معنیٔ او چوں غزال از مارمید
رقصِ تن از حرفِ او آموختند — چشم را از رقصِ جاں بر دوختند!
رقصِ تن در گردش آرو خاک را — رقصِ جاں برہم زند افلاک را!
علم و حکم از رقصِ جاں آید بدست — ہم زمیں ہم آسماں آید بدست!
فرد ازوے صاحبِ جذبِ کلیم! — ملّت ازوے وارثِ ملکِ عظیم!
رقصِ جاں آموختن کارے بود — غیرِ حق را سوختن کارے بود (۹)

علامہ محمد اقبال سے پہلے مثنوی مولانا رومیؒ کے شارحین کی توجہ اس کے اخلاقی پہلوؤں پر زیادہ رہی جب کہ دینی عقادات کی رسمیات کی روشنی میں مثنوی پر توانائیاں صرف کی جاتی رہیں، لیکن علامہ محمد اقبال اس کی عملی حیثیت کو سوز اور درد سے مملو کر کے دستورِ حیات بناتے رہے۔ انھوں نے اس کی نئی تعبیر کا ڈول ڈالتے ہوئے انقلاباتِ عالم کے لیے مثنوی مولانا رومیؒ کو محوری اور مرکزی حیثیت عطا کی۔ انسان کے اس کائنات میں عظیم مقام و مرتبے کا احساس راسخ کرنے کے لیے جتنی جدوجہد اقبال نے کی، اس کا مآخذ ہمیں مولانا رومیؒ کے علاوہ کوئی اور نظر نہیں آتا۔

ناقدین یا بعض علمانے اس اختلاف کی نشان دہی بھی دبے لفظوں میں کی ہے کہ مولانا جلال الدین رومیؒ باصفا صوفی ہیں مگر علامہ محمد اقبالؒ استیلا، جوش، قوت اور تخلیق کے شاعر ہیں اور ان کے نزدیک تزکیہِ نفس اور تصفیہ قلب بہت ضروری ہیں مگر جنگ و پیکار اور خودی کی نمود ترجیح اوّل ہیں۔ مذکورہ بالا دونوں حوالوں سے بات علمی سطح سے آگے بڑھ سکتی ہے۔ اقبال اور رومیؒ کے سلسلے میں ایک پھبتی اور بھی کسی جاتی ہے کہ اقبال نے دبستانِ فکرِ رومیؒ کی بنیاد رکھی۔ رومیؒ کی قدیم شرحوں اور مطالعاتِ رومیؒ کے اثرات کا خاتمہ کرتے ہوئے نئی شرح کی مگر جس رومیؒ کو اپنا پیر اور رہبر قرار دیتے ہیں، اُسی رومیؒ نے سنائی اور عطار کی اتباع کرنے کا اعتراف کرتے ہوئے "ما از پیِ سنائی و عطار آمدیم" لکھا مگر اقبال ان دونوں کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے۔ دراصل مولانا رومیؒ کو تو رومیؒ جیسا راہ نما میسر نہیں تھا بلکہ جو لوگ اُن کے سامنے موجود تھے اُن مین سے یہ دونوں انھیں بہتر لگے مگر اقبال کی خوش بختی کہ انھیں مولانا رومیؒ جیسا کامل رہبر میسر آیا، جس کے ہاں سوزِ زندگی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر تھا۔ ایسی صورتِ حال میں مولانا رومیؒ کو راہ نما کرنا عین فطری بات تھی۔

اقبال اور رومیؒ کے مشترک موضوعات کا عنوان بھی ایک کتاب کا موضوع ہے لہذا ی۔ جہاں بات صرف اشارات میں ہی ہو سکتی ہے۔ ان دونوں کے ہاں باطنی حواس جیسے "قوت اشراق" بھی کہا جاتا ہے کی برتری ہے۔ حواس

خمسہ کی آخری حد سے آگے کے حقائق کا ادراک قوتِ اشراق سے ہی ممکن ہے اور یہی اِن دونوں حکما کا اہم ترین مشترک موضوع ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

ہے ذوق تجلی بھی اِسی خاک میں پنہاں غافل تُو ترا صاحبِ ادراک نہیں ہے(۱۰)

تصورِ عشق و عقل ان دونوں عبقریوں کے ہاں کس درجے اہم رہا ہے، یہ بتانے اور سمجھانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اسی طرح روح کے دوام کے بارے میں بھی دونوں کا نظریہ یکساں ہے۔ دونوں کا خیال ہے کہ مرگِ بدن سے روح نہیں مر سکتی۔ جبر و قدر کا مسئلہ تو کیا فلسفہ، کیا الہیات اور کیا عمومی افکار، ہر جگہ بنیاد موضوعِ بحث ہے۔ اس سلسلے میں اقبال اور رومیؒ معتدل نقطہ نظر کے حامل ہیں۔ ان کے خیال میں انسان کی عمل کی آزادی، علی الاطلاق نہیں ہے بلکہ ارادہ و عمل میں ایک خاص حد تک آزاد ہے۔ اور اس قدر آزاد ہے کہ اپنے ارد گرد کائنات کی صورت تک تبدیل کرنے پر ایک حد تک قادر ہے۔

موت انسانی زندگی کا ایک بے حد خوف ناک منطقہ ہے مگر یہ دونوں نابغے اس سلسلے میں بھی نہ صرف یہ کہ اشتراک رکھتے ہیں بلکہ اعتدال کے بھی قائل ہیں۔ ان کے خیال میں موت تو ماندگی کا وقفہ ہے اور دم لے کر دوبارہ چل پڑیں گے۔ اسی طرح مال و منال کے ردّ و قبول میں بھی اعتدال ان کا مشترک اور اہم موضوع ہے۔ فقر کا تصور بھی اِسی مال و منال کے تصور سے جڑا ہوا ہے۔ عرفانِ ذات، شرفِ انسانی اور احیائے ملت جیسے موضوعات ایسے ہیں کہ رومیؒ اور اقبال کو حیاتِ دوام سے ہم کنار کرنے کے لیے کافی ہیں۔ آخر میں علامہ محمد اقبال کا حکیم محمد حسین عرشی کے خط کے جواب میں ۱۹۔مارچ ۱۹۳۵ء کو لکھا:

> ”مثنوی رومیؒ پڑھنے سے اگر قلب میں گرمیٔ شوق پیدا ہو جائے اور تو اور کیا چاہیے، شوق خود مرشد ہے۔ میں ایک مدت سے مطالعہِ کتب ترک کر چکا ہوں۔ اگر کچھ پڑھتا ہوں تو صرف قرآن یا مثنوی رومیؒ۔ افسوس ہے ہم اچھے زمانے میں پیدا نہ ہوئے۔
>
> کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں
> ایک بھی صاحبِ سرور نہیں
>
> بہر حال قرآن اور مثنوی کا مطالعہ جاری رکھیے۔“(۱۱)

خط کا یہ ٹکڑا بھی دراصل ایک بھاری بھر کم موضوع ہے، جس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن مضمون اس بحث کا متحمل نہیں ہو سکتا تاہم اتنا ضرور اور سہولت کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ علامہ محمد اقبال کے شعر و فکر پر جتنا اثر مولانا جلال الدین رومیؒ کے شعر و فکر کا ہے، کسی اور شخصیت کا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ مولانا جلال الدین رومیؒ کی مثنوی کی جس طرح جدید تشریح و تفہیم کا کارنامہ انجام دیا ہے، وہ بھی صحیح معنوں میں

نادر اور بے مثال ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (فارسی)، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۵ء، ص:۳۷۲

۲۔ میاں بشیر احمد، مولانا رومی اور اقبال، مشمولہ: پیر رومی و مرید ہندی، مرتبہ: محمد اکرام چغتائی، پیر رومی و مرید ہندی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص:۴۶

۳۔ شبلی نعمانی، علامہ، سوانح مولانا رومی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص:۷۰

۴۔ محمد عبد السلام خان، مولانا، افکارِ رومی، لاہور: عبد اللہ اکیڈمی: ۲۰۱۷ء، ص:۱۶۔۱۷

۵۔ خلیفہ عبد الحکیم، ڈاکٹر، حکمتِ رومی، لاہور: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، ۱۹۸۱ء، ص:۲۳

۶۔ محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال (فارسی)، ص:۹۳۸

۷۔ ایضاً، ص:۹

۸۔ Muhammad Iqbal, Allama, The Development of Metaphysics in Persia, Lahore: Sang-i-meel Publications, 2004, p:95 .100

۹۔ محمد اقبال، علامہ: کلیات اقبال (فارسی)، ص:۹۶۷

۱۰۔ ایضاً، ص:۳۲

۱۱۔ مظفر حسین برنی، سید، کلیاتِ مکاتیبِ اقبال (جلد چہارم)، جہلم: بک کارنر، ۲۰۱۶ء، ص:۹۶